ملک زدروازۂ او فتح یاب | سیزدہ دروازہ وصد فتح باب
نام بلندش رہِ بالا گرفت | تا بہ ختن شدرہِ یغما گرفت
گر شنود قصۂ ایں بوستاں | مکہ شود طائفِ ہندوستاںؔ

(قرانُ السعدین)

انیسویں صدی میں جبکہ سلطنتِ مغلیہ پر نزع کا عالم طاری تھا اور زوال وانحطاط کے آثار ہر طرف نمایاں تھے، دہلی اپنی دیرینہ شان وشوکت کو خیرباد کہہ چکنے کے باوجود انتہائی بارونق تھی ابھی کچھ نقوش باقی تھے جن سے "کاروانِ رفتہ" کی عظمت وشوکت کا اندازہ ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں بھی اگر کسی نے یہاں کے علماء سے دہلی کی حالت کے متعلق سوال کرلیا تو بے اختیار کہہ اٹھے ؎

اِنَّ البلادَ اماءٌ وھی سیدۃٌ | واَنھا دُرۃٌ والکلُّ کالصدَفْ

(دوسرے شہر لونڈیاں ہیں اور دلی ملکہ۔ یہ موتی ہے اور باقی سب سیپیاں) [2]

اور اس میں واقعی کوئی مبالغہ بھی نہ تھا یہاں اب بھی علم وعرفان کے ایسے چشمے ابل رہے تھے جن سے ہندوستان ہی نہیں بلکہ بیرونِ ہند بھی مستفیض ہورہا تھا۔ تعجب کی بات ہے کہ اسلامی ہند نے اپنے زوال اور انحطاط کے زمانہ میں دنیا کے مسلمانوں کو مشعلِ راہ دکھائی۔ ایک ایسے نازک دور میں جبکہ تمام دنیائے اسلام حدیث وسنت کو بھول چکی تھی۔ دہلی ہی نے اس کو بھولا ہوا سبق یاد دلایا جس کا اعتراف مصر کے مشہور فاضل علامہ رشید رضا نے اس طرح کیا۔

---

[1] ایک مجلس میں خسروؒ کے یہ اشعار پڑھ کر شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرمانے لگے۔
"درد قتیکہ خسرو گفتہ دہلی ہم چنیں بود کہ ہمچو نظام الدین اولیاء سلطان المشائخ موجود بود کہ می گویند چوں آدم داخل غیاث پور می شد حالش دگرگوں می شد"
(ملفوظات شاہ عبدالعزیزؒ (مطبوعہ میرٹھ) ص ۶۳)

[2] یہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا شعر ہے۔ سرسید نے آثارالصنادید ص ۴۷ پر نقل کیا ہے۔ میرے پیشِ نظر آثار کا سب سے پہلا نسخہ ہے بعد کے نسخوں میں باب چہارم نہیں ہے۔

ولولا عنایة اخواننا علماء الھند	ہمارے ہندوستانی بھائیوں میں جو علماء ہیں اگر
بعلوم الحدیث فی ھذا العصر	حدیث کے علوم کے ساتھ اُن کی توجہ نہ ہوتی
لقضی علیھا بالزوال من امصار	تو شرقی ممالک سے یہ علم ختم ہو چکا ہوتا کیونکہ
الشرق فقد ضعفت فی مصر الشام	مصر، شام، عراق، حجاز میں دسویں صدی ہجری
والعراق والحجاز منذ القرن العاشر	سے یہ علم ضعف کا شکار ہو چکا تھا اور چودہویں
للھجرۃ حتی بلغت منتھی الضعف فی	صدی کے اوائل تک ضعف کی آخری منزل
اوائل ھذا القرن الرابع عشر۔"	پر پہنچ گیا تھا۔"

چند نفوسِ قدسیہ کی موجودگی نے دہلی کو تمام ممالکِ اسلامیہ کی توجہ کا مرکز بنا دیا۔ شاہ غلام علی صاحبؒ کی خانقاہ میں شام، مصر، چین اور حبش کے لوگوں کے جھمگٹے لگے رہتے تھے تو دوسری طرف شاہ عبد العزیز صاحبؒ کے خرمنِ کمال کے خوشہ چین ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے تھے اور علوم دینی کا چرچا کر رہے تھے۔ سلطنت دم توڑ رہی تھی، سیاسی زوال و پستی کی آخری منزلیں طے ہو رہی تھیں، لیکن "ذہنی شعور" ابھی مردہ نہ ہوا تھا۔ کچھ بیدار مغز انسان تجدید و احیاء کے نئے راستے تلاش کر رہے تھے۔ وہ اس سیاسی زوال کو مذہبی اور ذہنی زوال کا پیش خیمہ بنانا نہیں چاہتے تھے۔ اللہ کے یہ فرماں بردار بندے حوادث کا مقابلہ کر رہے تھے اور ملت کو مذہبی انتشار اور ذہنی تنزل سے بچانے میں مصروف تھے۔ اُن کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ سلطنت کا جاہ و جلال ختم ہونے کے بعد بھی مذہب کی رونق کم نہ ہوئی۔ مذہب میں لوگوں کی دلچسپی اسی طرح برقرار رہی۔ مسجدوں کی وہی شان تھی۔ رمضان کے مہینے میں چھوٹی چھوٹی مسجدوں میں دو دو تین تین جگہ تراویح

لے۔ "شاگردان وسے در اقالیم دور و دراز رسیدہ باب علوم دینی بروے خلق کشادند"
خزینۃ الاصفیاء جلد دوم ص ۳۸۸۔

ہوتی تھی[۱] - جامع مسجد کا تو کچھ ذکر ہی نہیں - وہاں جتنی جگہ تراویح ہوتی تھی اس کی تعداد حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی زبانی سن کر حیرت ہوتی ہے۔[۲]

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ نے یک دم دہلی کی بساط الٹ دی، پرانی مجلسیں درہم برہم ہوگئیں علمی و مذہبی محفلیں سرد پڑ گئیں - گھر کے گھر بے نور و بے چراغ ہوگئے ؎

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط دامانِ باغباں و کفِ گلفروش ہے

یا صبحدم جو دیکھئے آکر تو بزم میں نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے (غالب)

مسجدیں مسمار ہوگئیں، خانقاہیں تباہ و برباد ہوگئیں، مدرسوں میں کھیتی ہونے لگی - مسجد اکبرآبادیؒ جس کی رفعت و شان کے آگے گنبدِ اخضر پست[۳] معلوم ہوتا تھا ایسی تباہ و برباد ہوئی کہ نام و نشان تک باقی نہ رہا - مدرسہ رحیمیہ جہاں سے ولی اللّٰہی حکمت کا چشمہ ابلا تھا اور جہاں شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ محمد اسحاقؒ نے قرآن و حدیث کے درس دیئے تھے وہاں "مدرسہ رائے بہادر لالہ رام کشن داس" کا تختہ لگ گیا[۴]" میاں کالے صاحب مغفور کا گھر اس طرح تباہ ہوا کہ جیسے جھاڑو دیدی - کاغذ کا پرزا، سونے کا تار، پشمینہ کا بال باقی نہ رہا - شیخ کلیم اللہ جہاں آبادیؒ کا مقبرہ اجڑ گیا - کیا اچھے گاؤں کی آبادی تھی - ان کی اولاد کے لوگ تمام اس موضع میں سکونت پذیر تھے اب ایک جنگل ہے اور میدان میں قبر - اس کے سوا کچھ نہیں[۵]"

بڑے بڑے گھرانے تباہ و برباد ہوگئے - عزت و ناموس کا بچانا محال نظر آنے لگا - جب مصائب ناقابلِ برداشت ہوگئے تو بڑے بڑے بزرگ اور عالم دہلی چھوڑنے پر مجبور ہو گئے -

---

۱ آثارالصنادید ص ۱۳۳ - ۲ ملفوظات شاہ عبدالعزیزؒ (مطبوعہ میرٹھ)

۳ آثارالصنادید ص ۲۷

۴ واقعات دارالحکومت دہلی" مولوی بشیرالدین ج ۲ ص ۱۶۷

۵ غالب کا خط سید احمد حسن مودودی کے نام - اردوئے معلیٰ (آگرہ ۱۹۱۲ء) ص ۱۸۴ - ۱۸۳ -

میاں کالے صاحب کے بیٹے میاں نظام الدین نے حیدر آباد کا رخ کیا[1]۔ اور شاہ فخر الدینؒ کی خانقاہ سونی پڑ گئی۔ شاہ احمد سعید صاحب مجددیؒ نے حرمین الشریفین کی راہ لی۔ اور شاہ غلام علی صاحبؒ کی خانقاہ کا چراغ گل ہو گیا۔ ہر طرف حسرت اور مایوسی چھا گئی۔ جو اس ہنگامۂ دار و گیر سے بچے وہ "کافور و کفن" کی تمنا کرنے لگے[2]۔ زندگی وبال معلوم ہونے لگی۔ جب کسی نے ان گذشتہ محفلوں کا ذکر چھیڑا تو بے اختیار دل کو پکڑ کر کہنے لگے ؎

تذکرہ دلیٔ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز (حالی)

اس مضمون میں ہم ۱۸۵۷ء سے پہلے کے اُن مشائخ و علماء کا ذکر کریں گے جنھوں نے اس طوفانی دور میں اسلامی سوسائٹی کو ابتری اور انتشار سے بچایا اور حدیث و قرآن کا وہ چرچا کیا کہ مذہب، سیاسی زوال کے خطرناک اثرات سے بچ گیا۔ اس زمانہ میں علماء و صوفیاء کی کوشش تھی کہ عوام کو سنت و شریعت کا پابند بنایا جائے۔ وہ اسی میں مسلمانوں کے مرض کا علاج اور آئندہ ترقی کا راز پاتے تھے۔ چنانچہ خانقاہوں میں شریعت و سنت کی تلقین ہوتی تھی اور مدرسوں میں حدیث و کتاب کا درس۔

حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ | حضرت شاہ غلام علی صاحب رحمتہ اللہ علیہ (۱۱۵۶-۱۲۴۰) کی خانقاہ[3] اس زمانہ میں دلی کی سب سے زیادہ شاندار خانقاہ تھی۔ شاہ صاحبؒ نقشبندیہ مجددیہ سلسلہ کے

---

[1] غالب ایک خط میں لکھتے ہیں "حال میاں نظام الدین کا یہ ہے کہ جہاں سب اکابر شہر کے بھاگ گئے تھے وہ بھی بھاگ گئے۔ بڑودہ میں رہے، اورنگ آباد میں رہے۔ حیدرآباد میں ہیں۔" اردوئے معلی ص ۲۳۱ -

[2] "مجھے کافور و کفن کی فکر پڑ رہی ہے وہ ستم گر شعر و سخن کا طالب ہے" (غالب ص ۲۱۳) دسمبر ۱۸۵۷ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں: "رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے شہر میں ہے کون جو آوے۔ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں" (ص ۶۰) جنوری ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں یوں لکھتے ہیں "زندہ ہوں مگر زندگی وبال ہے" (ص ۶۰)

[3] خانقاہ کے محل وقوع کے لئے ملاحظہ ہو۔ واقعات دار الحکومت دہلی - جلد دوم ص ۱۵۳

مشہور بزرگ حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے عزیز مرید اور خلیفہ تھے۔ علم وفضل، زہد وورع میں یکتائے عصر اور یگانۂ روزگار تھے۔ ان کی خانقاہ بقول حالی "دین دار مسلمانوں کا ملجا و ماویٰ تھی"[۵۱] اُن کے ایک ہزار کے قریب خلیفہ اور لاکھوں مرید تھے[۵۲]۔ اور مرید بھی اس مرتبے کے کہ ان کی علمیت وفضیلت کے شہرہ سے مصر وہندوستان گونج رہا تھا[۵۳]۔ دور دور سے لوگ شاہ صاحبؒ کی خدمت میں عقیدت وارادت کی نذر لیکر حاضر ہوتے تھے سرسید[۵۴] کا بیان ہے۔

"میں نے حضرت کی خانقاہ میں اپنی آنکھ سے روم وشام اور بغداد اور مصر اور چین اور حبش کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ حاضر ہو کر بیعت کی اور خدمت خانقاہ کو سعادتِ ابدی سمجھے اور قریب قریب کے شہروں کا مثل ہندوستان اور پنجاب اور افغانستان کا تو کچھ ذکر نہیں کہ ٹڈی دل کی طرح امڈے تھے"[۵۵]

غلام محی الدین قصوری نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ شاہ صاحب خود فرمانے لگے کہ "ہمارا فیض دور دور پہنچ گیا ہے۔ حضرت مکہ معظمہ میں ہمارا حلقہ بیٹھتا ہے۔ حضرت مدینہ منورہ میں ہمارا حلقہ بیٹھتا ہے۔ بغداد شریف، روم ومغرب میں ہمارا حلقہ جاری ہے"[۵۶]

---

[۵۱] "حیاتِ جاوید" از حالی (دعد ایڈیشن ۱۹۰۱ء) جلد دوم - ص ۹

[۵۲] "جواہر علویہ" از مولانا محمد رؤف احمد خلیفہ حضرت شاہ غلام علیؒ (مطبوعہ لاہور) ص ۲۴۱۔

[۵۳] شاہ صاحبؒ کے ایک عظیم المرتبت مرید شیخ خالد کردی تھے۔ جن کے مناقب میں علامہ شامیؒ نے ایک مستقل رسالہ "سل الحسام الہندی لنصرۃ مولانا خالد نقشبندی" لکھا تھا۔

[۵۴] سرسید اور اُن کے گھرانے کو شاہ صاحبؒ سے خاص عقیدت تھی۔ شاہ صاحبؒ بھی ان پر خاص التفات فرمایا کرتے تھے۔ سرسید کا نام شاہ صاحب ہی نے رکھا تھا (حیات جاوید ج ا ص ۳۴) اور ان کی بسم اللہ بھی شاہ صاحب ہی نے پڑھائی تھی۔ (حیات جاوید ج ا ص ۴۱)

[۵۵] آثار الصنادید۔ ص ۱۸ (باب چہارم)

[۵۶] مشائخ نقشبندیہ مجددیہ از مولوی محمد حسن۔ ص ۳۰۹

شاہ صاحبؒ کی خانقاہ میں بڑی رونق رہتی تھی۔ پانچ پانچ سو فقیر[۵۱] ان کی خانقاہ میں ہوتا تھا اور وہ اُن کے کھانے اور پہننے کا بندوبست کرتے تھے، توکل کا یہ عالم تھا کہ کوئی نواب یا رئیس جاگیر پیش کرتا تو قبول نہ کرتے بلکہ جواب میں فرما دیتے اللہ تعالیٰ کے وعدے ہماری جاگیریں ہیں[۵۲]۔ ایک مرتبہ امیر محمد خاں والی ٹونک نے وظیفہ قبول کرنے کی درخواست کی۔ مولانا رؤف احمد مصنف جواہر علویہ کو حکم ہوا کہ جواب میں یہ شعر لکھ دو ؎

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم   با میر خاں بگو کہ روزی مقرر است[۵۳]

قناعت اس قدر تھی کہ زبان پر شیخ ابن یمین کے یہ شعر رہتے تھے ؎

نانِ جویں و خرقۂ پشمین و آب شور   سیپارۂ کلام و حدیث پیمبری

ہم نسخۂ دو چار ز علمیکہ نافع است   در دیں نہ لغو بوعلی و ژاژ عنصری

تاریک کلبۂ کہ پئے روشنیٔ آں   بیہودہ منتے نبرد شمع خاوری

با یکدو آشنا کہ نیرزد بہ نیم جو   در پیش چشم ہمت او ملکِ سنجری

ایں آں سعادت است کہ حسرت برو برد   جویائے تخت قیصر و ملک سکندری[۵۴]

شاہ صاحبؒ حدیث کے بڑے زبردست عالم تھے۔ انھوں نے حدیث کی سند امام المحدثین حاجی محمد افضل صاحبؒ سے جو مرزا مظہر جان جاناںؒ کے بھی استاد تھے حاصل کی تھی[۵۵]۔ وہ خود نہایت پابندی سے فجر اور ظہر کے بعد طلباء کو تفسیر و حدیث کا درس دیتے تھے[۵۶]۔ فرمایا کرتے تھے

---

۵۱ آثار الصنادید ص ۱۸، جواہر علویہ ص ۱۴۲ - میں فقیروں کی تعداد دو سو لکھی ہے۔

۵۲ جواہر علویہ ص ۱۴۶

۵۳ جواہر علویہ ص ۱۴۶، آثار الصنادید ص ۱۸، مشائخ نقشبندیہ مجددیہ ص ۳۱۳

۵۴ جواہر علویہ ص ۱۵۳ - خزینۃ الاصفیاء ج ا ص ۶۹۷

۵۵ جواہر علویہ ص ۱۴۳ ۵۶ ایضاً ص ۱۴۳ و ۱۴۴۔

کہ میں کتابیں ایسی ہیں جن کی نظیر نہیں۔ کلام اللہ، بخاری۔ اور مثنوی مولانا روم۔[۱]

شاہ غلام علی صاحبؒ کو اتباع سنت و شریعت کا خاص خیال رہتا تھا۔ وہ اپنے مریدوں اور مخلصوں کو برابر نماز کی تاکید فرماتے رہتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ نماز تمام عبادات کی جامع اور تمام طاعتوں پر حاوی ہے۔[۲] خلاف شرع و سنت لوگوں سے وہ بہت خفا ہوتے تھے اور اپنی مجلس میں ان کا آنا تک گوارہ نہ فرماتے تھے۔[۳] غرض شاہ صاحب نے اپنی عمر شریعت و سنت کی تلقین میں بسر کی۔ جب وصال کا وقت آیا تو وصیت نامہ میں بھی سنت نبویؐ پر عمل کرنے کی تاکید فرمائی۔[۴] رسول مقبولؐ سے ان کو عشق تھا۔ زبان پر نام آتا کہ ایک کیفیت طاری ہو جاتی۔[۵] رسول پاکؐ سے ان کی عقیدت اور اتباع سنت کا عالم دیکھ کر سرسید بے اختیار پکار اٹھتے ہیں "اور میں تو اس بات پر عاشق ہوں کہ باوجود اتنی آزادی او ساز خودرفتگی کے سر مو احکام شریعت سے تجاوز نہ تھا۔ اور جو کام تھا بہ اتباع سنت تھا"۔[۶]

شاہ صاحبؒ سے آخری زمانہ میں جو فیض جاری ہوا وہ عدیم النظیر تھا۔ ان کے مریدین کا جال تمام عالم اسلام میں پھیل گیا تھا۔ ہندوستان میں کوئی مقام ایسا نہیں تھا جہاں ان کے مرید و عقیدت مند نہ ہوں۔ ان کے مشہور خلیفہ خالد کردیؒ نے ان کی شان میں ایک قصیدہ لکھا ہے جس کے چند شعر یہ ہیں سے

امام اولیا سیاح بیدائے خدا بینی ندیم کبریا سباح دریائے خدا دانی
مہیں رہنمایاں شمع جمع اولیائے دیں دلیل پیشوایاں قبلۂ اعیان روحانی

---

[۱] جواہر علویہ۔ ص ۱۵۲۔ مثنوی کے متعلق تو صحیح کہا گیا ہے "ہست قرآں در زبان پہلوی"۔
[۲] " " " ۱۵۵۔ [۳] آثار الصنادید ص ۲۱۔ [۴] جواہر علویہ ص ۲۳۶
[۵] " " " ۱۴۷۔ [۶] آثار الصنادید ص ۲۰۔

چراغ آفرینش مہر برج دانش و بینش کلیدِ گنج حکمت محرمِ اسرارِ سبحانی
امینِ قدس عبداللہ شہ کز التفاتِ او دہد سنگِ سیہ خاصیت لعلِ بدخشانی

حضرت شاہ ابوسعید | حضرت شاہ ابو سعید صاحبؒ (۱۲۵۰-۱۱۹۶ھ) حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ کے مرید اور خلیفہ تھے اور اُن کے بعد سجادہ پر بیٹھے وہ بڑے جید عالم اور بڑے عالی مرتبت بزرگ تھے غلام سرور نے لکھا ہے۔

"جامع بود میاں علومِ ظاہری و باطنی و فقہ و حدیث و تفسیر" [۱]

علوم ظاہری میں وہ مفتی شرف الدین صاحبؒ دہلوی اور مولانا شاہ رفیع الدین صاحبؒ کے شاگرد تھے۔ اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور مولانا سراج احمد صاحبؒ [۲] سے فقہ و حدیث کی سند حاصل کی تھی [۳]
کلام اللہ حفظ تھا۔ علم قرأت میں یکتائے روزگار تھے۔ کلام اللہ ایسی خوش آواز اور کمال قرأت سے پڑھتے کہ لوگ دور دور سے سننے آتے تھے۔ [۴]

شاہ صاحبؒ رات دن علوم دین کے درس میں صرف ہوتے تھے۔ وقت بچتا تو کلام اللہ لکھ کر وقف کرتے تھے [۵] اتباع سنتِ نبویؐ کا خاص اہتمام تھا۔ شاہ غلام علی صاحبؒ کے بعد ۹، یا ۱۰ سال تک سجادہ پر بیٹھے اور ہمیشہ اتباع سنت کی تلقین کرتے رہے، آپ کی شکل بے حد نورانی تھی اور بے اختیار آپ کی صحبت میں حاضر رہنے کو جی چاہتا تھا۔ [۶] اخلاق کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ ہر ملنے والا یہ سمجھتا تھا کہ جس قدر خصوصیت مجھ سے ہے کسی سے نہیں۔ مولوی محمد حسین مصنف مشائخ نقشبندیہ لکھتے ہیں "چونکہ آپ کے مزاج میں ایثار بدرجہ غایت تھا اس سبب سے تلخی و سختی

---

[۱] خزینۃ الاصفیاء، ج ۱ ص ۷۰۱ — [۲] مولانا سراج احمد صاحب بڑے عالم فاضل اور عابد تھے، آپ نے بہت سی تصانیف چھوڑی ہیں۔ مثلاً ترجمہ صحیح مسلم، صحیح ترمذی، شرح صعدہ شرح بنو سافرہ، بہان التاویل وغیرہ جواہر علویہ ص ۲۰۵ — [۳] خزینۃ الاصفیا۔ ج ۱ ص ۷۰۱
[۴] آثار الصنادید۔ ص ۲۳ — [۵] ایضاً۔ ص ۲۴ — [۶] ایضاً

فقر و فاقہ کہ حسن درویشی ہیں بہت جھیلیں۔ تحمل و بردباری و شکست و مسکنت آپ کے مزاج میں اس قدر تھی کہ جو شاہ صاحب قبلہ کے منکر تھے وہ بھی آپ کے مرید ہو گئے۔ [۱]

شاہ صاحبؒ کا گھر بار بھی تھا اور بال بچے بھی۔ ان علائق کے باوجود وہ ہمہ وقت عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ شاہ غلام علی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے " مجھ کو ابو سعیدؒ پر فخر ہے۔ میں نے اگر فقیری کی تو کسی کا غم نہیں رکھتا۔ ابو سعیدؒ کو دیکھو کہ باوصف علائق دنیاوی کے اپنے معبود کی عبادت میں مصروف ہے کہ گویا مطلق کوئی تعلق نہیں رکھتا۔" [۲]

شاہ ابو سعیدؒ سے ہزاروں آدمیوں نے فیض حاصل کیا۔ [۳] انھوں نے تمام غیر ممالک سے جہاں سلسلہ مجددیہ جاری تھا اپنا رابطہ قائم رکھا۔ شیخ خالد کردیؒ کے خطوط برابر آتے جاتے تھے۔ ایک خط جس سے سلسلہ کی اشاعت کا پتہ چلتا ہے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

"مرکز دائرہ غربت و مہجوری خالد کردی شہر روزی بعرض مقدس عالی مخدومی جناب ابی سعید مجددی معصومی میرساند اگرچہ بیمن ہمت حضرت قبلہ عالم روحی فداہ فیوض خاندان عالیہ آباء واجداد کرام آں مخدوم عالی مقام کہ بیرون از حیز تحریر و خارج از حوصلہ تقریر است اما بمحوائے مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ بمقام شکر گذاری برآمدہ عرض حضور می نماید کہ یک قلم تمامی مملکت روم و عربستان و دیار حجاز و عراق و بعضے از ممالک قلمرو عجم و جمیع کردستان انجذبات و تاثیرات طریقۂ علیہ سرشار ذکر و محامد حضرت امام ربانی" [۴]

آخر عمر میں آپ کو حرمین الشریفین کی زیارت کا شوق ہوا۔ راستے میں بمقام ٹونک وصال فرمایا آپ کو دہلی لا کر حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

---

[۱] مشائخ نقشبندیہ مجددیہ۔ ص ۳۳۳ - [۲] آثار الصنادید۔ ص ۴۴ - [۳] ایضاً ص ۲۵ -
[۴] " " " " ۳۰۹ -

شاہ احمد سعید صاحبؒ | شاہ ابو سعید صاحبؒ کے چار صاحبزادے تھے۔ آپ کے بعد بڑے لڑکے شاہ احمد سعیدؒ مجددی (۱۲۱۷ - ۱۲۷۷) سجادہ نشین ہوئے۔ شاہ احمد سعید صاحب حافظ تھے اور اپنے والد ماجد کی طرح عالم و فاضل تھے۔ حدیث و فقہ میں نہایت مہارت رکھتے تھے[1]۔ مولوی فضل امام صاحب اور مفتی شرف الدین صاحب سے علوم عقلیہ و نقلیہ حاصل کئے تھے۔ اور مولوی رشید الدین صاحب سے جو شاہ عبد العزیز صاحبؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے علم حدیث کی سند حاصل کی تھی[2]۔ درس و تدریس آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔ دور دور سے طلباء آپ کے پاس آتے تھے۔ علم دین پر پورے عبور اور کامل واقفیت کی وجہ سے استفتا آپ کے پاس بھیجے جاتے تھے اور آپ کے فتوی کو نہایت عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

شاہ صاحب اپنے بزرگوں کی طرح سنت و شریعت کی تلقین میں مشغول رہتے اور مریدوں کو اتباع سنت کی ہدایت فرماتے رہتے تھے۔ شاہ غلام علی صاحب فرمایا کرتے تھے "ابو سعید، رؤف، بشارت اللہ اور احمد سعید، اس زمانہ میں ستون دین محمدی ہیں۔"[3]

شاہ صاحبؒ کے زمانہ میں شاہ غلام علی صاحبؒ کی خانقاہ کی شان و شوکت برقرار رہی، اُن کے یہاں ہندوستان و خراساں سے لوگ آتے تھے اور اُن کے خلفاء قندھار و کابل میں موجود تھے[4]، انھوں نے شاہ غلام علی صاحبؒ کے سلسلہ کے بین الاقوامی نظام کو قائم رکھا۔ ہندوستان سے باہر بھی ان سے عقیدت و ارادت کا یہی عالم تھا۔ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ سے روایت[5] ہے "شاہ احمد سعید مجھ سے پہلے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تھے جب میں وہاں پہنچا تو آپ بہت مریض تھے۔ ترک لوگ قلعہ میں معالجہ کے لئے اٹھا لے گئے تھے۔ ترک ان کی بہت تعظیم و توقیر کرتے تھے۔[6]

---

۱ آثار الصنادید، ص ۵۵ ۲ خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۷۰۹۔ ۳ خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۷۰۹۔ ۴ ایضاً ۵ ایضاً
۶ شمائم امدادیہ، ترجمہ ملفوظات مکیہ۔ از حاجی محمد مرتضیٰ خاں (مطبوعہ قومی پریس لکھنؤ ۱۳۱۳ھ) ص ۱۷۶۔

غدر کے ہنگامہ میں شاہ صاحبؒ اپنے اہل وعیال کو لیکر مجبوراً حرمین الشریفین چلے گئے تھے۔ ان کے ہندوستان سے چلے جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقیدت وارادت کا ایک ایسا مرکز ٹوٹ گیا جس کے ذریعہ ہندوستان کے مسلمانوں کا تمام ممالکِ اسلامیہ سے قریبی روحانی رشتہ بندھا ہوا تھا اُن کے ہندوستان میں قیام کے زمانہ میں عجم وعرب کے بہت سے لوگ دلی کی طرف ہی رجوع کرتے تھے۔ شاہ صاحبؒ نے ۱۲۷۷ھ میں وصال پایا اور حضرت عثمانؓ کے روضہ کے قریب مدفون ہوئے۔ [1]

شاہ عبدالغنیؒ | شاہ عبدالغنی صاحبؒ (۱۲۹۶-۱۲۳۴) شاہ احمد سعید صاحبؒ کے چھوٹے بھائی تھے اور اُن کے بعد سجادہ پر بیٹھے تھے۔ ان کا علمی تبحر بے مثال تھا۔ انھوں نے حدیث کی کچھ کتابیں اپنے والد ابوسعید صاحبؒ سے پڑھی تھیں اور کچھ شاہ محمد اسحاق صاحبؒ سے۔ شاہ اسحاق صاحبؒ اور شاہ ابوسعید صاحبؒ دونوں محدث زماں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے شاگرد ہیں۔ اس طرح ہر دو سلسلہ سے آپ کی اسنادِ حدیث تیسری پشت پر حجۃ اللہ البالغہ سے جا ملی ہے۔ مشکوٰۃ شریف حضرت شاہ صاحب نے شاہ رفیع الدین صاحبؒ کے صاحبزادے مولانا مخصوص اللہ صاحبؒ کو پڑھ کر سنائی تھی اور بعد ہجرت مدینہ میں بخاری شریف کا کچھ حصہ تبرکاً شیخ محمد عابد الانصاری السندی ثم المدنی کو سنایا تھا۔ مدینہ منورہ ہی میں مقدونیہ کے مشہور عالم شیخ اسمٰعیل بن ادریس الرومی نے خود اپنی خوشی سے صحاح کی اجازت آپ کو عطا کی۔ ان سب اساتذہ کی اسانید بالتفصیل ایک مستقل کتاب کی صورت میں طبع ہو چکی ہیں جن کا نام "الیانع الجنی" ہے۔ [2]

غرض شاہ عبدالغنیؒ صاحب حدیث میں یگانۂ روزگار تھے۔ اپنے عہد کے پانچ بہترین اساتذہ

---

[1] واقعات دارالحکومت دہلی۔ ج ۲ ص ۱۵۴

[2] تذکرۃ الخلیل۔ مولانا عاشق الٰہی مرحوم (مطبوعہ میرٹھ) ص ۱۸-۱۷ نیز واقعات ص ۱۵۴

سند حدیث حاصل کر چکے تھے۔ علمی تبحر سے قطع نظر اُن کا تقدس اور تقویٰ بے مثال تھا۔ سرسید نے اسی وجہ سے ان کو "فنا فی السنت" لکھا ہے[۱]۔ شریعت کے معاملہ میں احتیاط کا یہ عالم تھا کہ صرف اس خیال سے کہ "ہندوستان میں جو طریق بیع وشرا بعض بعض فواکہ وغیرہ کا جاری ہے وہ از روئے شرع درست نہیں ان چیزوں کے مزہ سے واقف نہیں"[۲] شریعت کے اس احترام کی مثال قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں ہی میں مل سکتی ہے۔ شاہ صاحبؒ کی اس احتیاط کو دیکھ کر حضرت امام حنبلؒ کا وہ اہتمام یاد آجاتا ہے جو انھوں نے بغداد میں قیام کے زمانہ میں موصل سے آٹا منگانے کے سلسلہ میں کیا تھا۔ بغداد کو حضرت عمرؓ نے نمازیوں پر وقف کیا تھا اس لئے امام صاحب وہاں کا آٹا کھانا ناجائز تصور کرتے تھے اور موصل سے آٹا منگاتے تھے۔[۳]

حقیقت یہ ہے کہ شاہ عبدالغنی صاحبؒ شریعت کو مذہبی زندگی کا مرکز تصور کرتے تھے ان کا خیال تھا کہ مسلمان کے لئے سوائے اتباع شریعت، دین ودنیا میں کوئی راہِ فلاح ونجات نہیں۔ اسی لئے وہ مذہبی معاملات میں نہایت سختی برتتے تھے وہ فرمایا کرتے تھے "سوائے انحراف از حکمِ شریعت کے سخت سے سخت کوئی مصیبت نہیں"۔[۴]

شاہ عبدالغنی صاحبؒ سے فیض یاب ہونے کے لئے ملک کے گوشہ گوشہ سے طلبار آتے تھے اُن کی خانقاہ سینکڑوں علمار کا مرکز بن گئی تھی۔ اُن کے فیض تعلیم نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ جیسے عالم اور بزرگ پیدا کئے جو فقہ حنفی کے ایک راسخ القدم امام اور مجتہد تھے۔[۵]

---

[۱] آثار الصنادید۔ ص ۲۷ - [۲] ایضاً۔ [۳] احیار العلوم۔ امام الغزالیؒ۔ باب چہارم
[۴] آثار الصنادید۔ ص ۲۷ -
[۵] میں نے مولانا رشید احمد کو فقہ حنفی کا ایک راسخ القدم امام اور مجتہد پایا۔ آپ اپنے استاد مولانا عبدالغنی کے طریقۂ فکر کے بڑی سختی سے پابند تھے اور اس راہ میں پہاڑ کی طرح غیر متزلزل تھے۔"
— مولانا عبیداللہ سندھی (شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک۔ ص ۲۵۸)

غدر کے بعد شاہ صاحب ہندوستان سے ہجرت کر گئے اور مدینہ منورہ میں قیام فرمالیا۔ ۱۲۹۶ھ میں وصال فرمایا اور وہیں شاہ ابو سعید صاحبؒ کے قریب مدفون ہوئے۔[1]

شاہ محمد آفاق صاحبؒ | شاہ محمد آفاق صاحب (۱۲۵۱-۱۱۶۰) مجددیہ سلسلہ کے بڑے عظیم المرتبت بزرگ تھے۔ آپ شاہ ضیاء اللہ صاحب نقش بندیؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔[2] خواجہ میر درد کی صحبت میں بھی رہے تھے۔ اور اُن سے فوائدِ باطنی اخذ کئے تھے۔ آپ کے فیضانِ صحبت سے بہت لوگ مستفید ہوئے۔ ایک چشمۂ فیض تھا جو جاری تھا اور جہاں سینکڑوں تشنگانِ معرفت جمع ہوتے تھے۔ دلی میں آپ کا بڑا رعب اور احترام تھا شاہ غلام علی صاحبؒ نے کتاب "سید المرشدین" کے حاشیہ پر لکھا ہے۔

"حضرت شاہ محمد آفاق سلمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ضیاء اللہؒ سے جو حضرت خواجہ محمد زبیرؒ کے خلفا میں ہیں اس خاندان کی نسبت[3] سرگرمی کے ساتھ حاصل کی ہے اور اس وقت حلقہ اور مراقبہ اور افادہ نسبت میں ممتاز ہیں۔"[4]

یہ ایک معاصر بزرگ کی رائے ہے اور لفظ بہ لفظ صحیح ہے۔ حقیقتاً آپ کا آستانہ مخزن فیض و برکت بنا ہوا تھا۔ اور دور دراز سے لوگ آتے تھے اور فیض پاتے تھے۔[5] شاہ غلام علی صاحبؒ آپ کے علم و فضل زہد و ورع سے اس قدر متاثر تھے کہ اپنے مریدوں کو بعد تعلیم آپ کی خدمت میں تکمیل کیلئے بھیجتے تھے[6] شاہ صاحبؒ جب کابل تشریف لے گئے تو زماں شاہ بادشاہ کابل آپ کے دست حق پرست پر بیعت ہوا۔[7]

---

[1] واقعات دار الحکومت دہلی ج ۲ ص ۴ ۱۵۔ [2] آثار الصنادید ص ۲۸۔ واقعات ص ۵۰۳ ج ۲۔

[3] مزارات اولیائے دہلی از محمد عالم شاہ فریدی (مطبوعہ دہلی) ص ۱۴۱۔

[3] "نسبت" کا لفظ صوفیاء میں ایک خاص معنی میں استعمال ہوتا ہے اس کی تشریح شاہ فضل رحمان گنج مراد آبادی کی زبانی سنئے۔ صاحب نسبت وہ ہے جسے "جاگتے سوتے کسی حال میں غفلت نہیں ہوتی اور جس امر کی طرف متوجہ وہ ہوتا ہے اس کی طرف سے اس کا القا ہو جاتا ہے ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں"۔ ارشاد رحمانی (مطبوعہ دلی ۱۳۱۲ھ) ص ۳۰۔

[4] بحوالہ واقعات دار الحکومت دہلی ج ۲ ص ۵۰۳۔ [6] ایضاً۔ نیز مزارات اولیائے دہلی ص ۱۴۱۔

[5] [7] واقعات۔ ج ۲ ص ۵۰۳ - مزارات ص ۱۴۱

آپ میں زہد و اتقا اس درجہ تھا کہ ہر شخص صحبت میں رہ جاتا تھا ساتھ ساتھ کسر نفسی بے حد تھی آپکے ہزاروں مرید اور بیشمار خلفا تھے بعض مرید نہایت ذی مرتبت عالم اور بزرگ تھے اور اپنے زمانہ میں یگانہ و یکتا سمجھے گئے مثلاً شاہ فضل رحمان صاحبؒ جن کے خرمن کمال سے سینکڑوں ہزاروں نے فیض حاصل کیا[1]۔ اور شاہ نصیر الدین دہلوی جو شاہ رفیع الدین صاحب کے نواسہ اور شاہ اسحٰق صاحب کے داماد تھے ان دونوں بزرگوں نے شاہ محمد آفاقؒ کے نام کو شہرۂ آفاق کر دیا۔ ۱۲۵۱ھ میں حضرت شاہ محمد آفاق صاحب نے وصال فرمایا۔ منڈی کے قریب مغل پورہ میں ایک چھوٹی سی مسجد کے عقب میں آپ کا مزار ہے[2]۔

حاجی علاء الدین صاحب حاجی علاء الدین صاحبؒ، شاہ محمد آفاقؒ کے خلیفہ اور سجادہ نشین تھے اُنھوں نے بڑا مجاہدہ کیا تھا۔ تمام وقت عبادت میں صرف کرتے تھے آخر عمر میں گو آپ آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے اور پاؤں نہیں اُٹھ سکتے تھے لیکن صوم و صلوٰۃ کی پابندی کا وہی عالم تھا[3] ایک لمحہ بھی طاعتِ حق سے غافل نہیں ہوتے تھے، اُن کے زہد و اتقا نے شاہ محمد آفاقؒ کی خانقاہ میں عقیدتمندوں کے ہجوم کو برقرار رکھا۔

مولانا شاہ قطب الدین صاحب چشتیہ سلسلہ میں اس وقت سب سے زیادہ شہرت اور عزت حضرت شاہ فخر الدینؒ کے خاندان کو حاصل تھی۔ شاہ صاحب نے دلی میں جو مقبولیتِ عامہ حاصل کی تھی وہ اپنی مثال آپ تھی۔ شاہ و گدا، عارف و عامی، سب ہی اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور ان سے فیض حاصل کرتے تھے شاہ فخر الدین صاحبؒ کے بعد اُن کے فرزند مولانا شاہ قطب الدین صاحبؒ مسند نشین ہوئے، ان میں اپنے باپ کی بہت سی خصوصیات پائی جاتی تھیں۔ اس لئے وہ بہت جلد مرجع خلائق بن گئے۔ بادشاہ نے بھی اُن سے بیعت کی۔ شجرۃ الانوار میں لکھا ہے "حضرت ظل سبحانی محمد اکبر شاہ بادشاہ صاحبقران ثانی ادام اللہ سلطنتہ وارفع درجتہ، باعتقاد تمام مرید آں فرزند رشید حضرت فخر صاحب گشتند و بعضے فرزندان و متعلقان خود را نیز مرید کنانیدند و بمحبت تمام خود را داخل سلسلہ فخریہ نمودہ بادشاہ کونین گشت"[4]۔

۱۲۳۹ھ[5] کو آپ نے وصال فرمایا اور حضرت قطب صاحب کے جوار میں آسودہ ہوئے۔

(باقی آئندہ)

[1] الشرف السوانح۔ حصہ اول ص ۱۱۱ - ۱۱۷۔ [2] واقعات۔ ج ۲ ص ۵۰۲۔ مزارات ص ۱۴۱۔ [3] آثار الصنادید ص ۳۰ [4] شجرۃ الانوار (قلمی نسخہ) آخری صفحہ [5] واقعات (ج ۲ ص ۲۹۷) میں آپ کا سنہ وفات ۱۲۳۰ھ لکھا ہے لیکن یہ غلط معلوم ہوتا ہے۔ مزارات میں ۱۲۳۹ھ ہے اور یہی غالباً صحیح ہے۔

عربی ادب میں بہاریہ مضامین

(جناب مولوی حافظ سید رشید احمد صاحب ارشد ایم۔ اے)

بہت سے لوگوں کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ عرب کے صحرانشین اور بدو شاعروں کے اشعار میں بھی موسم بہار کا تذکرہ موجود ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عرب کی جغرافی حیثیت کی مطابقت میں عرب کی قدیم جاہلیت کی بہاریہ نظمیں ان رنگینیوں اور رعنائیوں سے خالی ہیں جو عجمی اور فارسی شاعروں کا طرۂ امتیاز ہے۔ جس کی وجہ محض یہ ہے کہ اس زمانہ کے عرب صحرانشین اور خانہ بدوش تھے اور شہری زندگی کے تکلفات اور آرائشوں سے آلودہ نہیں ہوئے تھے عرب کے لق ودق بیابانوں اور ریگستانوں کی تند و گرم اور آتشیں بگولوں میں موسم بہار کی دھندلی سی جھلک اگر نظر آتی تھی تو وہ ان قدرتی نخلستانوں میں دکھائی دیتی تھی جو قدرتی آب وہوا سے پرورش پاتے تھے اور جہاں چند دنوں کے لئے ان بادیہ نشینوں کے خیمے گڑ جاتے تھے۔ یہی ان کے خوشگوار دن تھے جسے بہار سمجھ لیجئے اور ان ہی خوشگوار دنوں کی یاد عرب کے ان فطرتی شاعروں کو ہمیشہ تڑپاتی تھی۔ چنانچہ عرب کی حقیقی شاعری کے بانی اور نامراد شاعر امرؤالقیس کی شاعری انہی خوشگوار ایام اور مٹے ہوئے آثار کا مرثیہ ہے۔

جاہلیت کی شاعری عرب کا شاعر ہمارے ان اردو شاعروں کی طرح نقال نہ تھا جو اپنے ہندوستانی ماحول کو چھوڑ کر ایرانی شاعری کی تقلید میں گل وبلبل کے فسانے سناتے ہیں اور اس طرح ان کی شاعری حقیقت اور ماحول سے کوسوں دور ہو کر ہمارے جذبات اور زندگی کی

ترجمانی نہیں کرتی ہے۔ برخلاف اس کے عہدِ جاہلیت کے انہی شاعروں کے کلام سے ہم ان کی طرزِ معاشرت، جذبات وخیالات ومشاغل، یہاں تک کہ ان کے عارضی پڑاؤ، درختوں، پھلوں، پھولوں، پرندوں اور جانوروں تک کے نام معلوم کرسکتے ہیں۔ ان کا موسم بہار بہت مختصر اور سادہ ہوتا تھا جس کی تفصیلی کیفیات آپ ان کی زبان سے خود سن سکتے ہیں، یہ بہار آفریں ایام ان کے دلوں پر جو نقش چھوڑ گئے ہیں، ان کا کلام ان سے بھرا ہوا ہے۔ تپے ہوئے ریگستانوں میں کسی وقت ٹھنڈی ہوا کے جھونکے انھیں بغداد، بصرہ، شیراز وکشمیر کے چمنستانوں سے زیادہ لطف دیتے تھے خاردار جھاڑیاں اور درخت ان کے سبزہ زار تھے، گھوڑے اور اونٹنیاں ان کے رفیق اور محبوب تھے جو اس "بحرِ خشک" میں ان کیلئے سفینہ اور جہاز کا کام دیا کرتے تھے۔ محبوب کے فراق اور گذشتہ ایام وصال کی یاد کے نغمے ان کی موسیقی تھی۔

اسلامی دور | اسلامی دور کے عربی شاعروں کے برخلاف جاہلیت کی شاعری میں موسمِ بہار کے مخصوص پھل اور پھولوں کا تذکرہ نہیں ملتا۔ گلاب، یاسمین، گل لالہ۔ گل لاجورد، بنفشہ، گل خیری، اور پھلوں میں سے کسی مشہور پھل کی روئیدگی اور خوبصورتی کی تعریف نہیں کی گئی بلکہ چند ایسے غیر مشہور درختوں، پھل اور پھولوں کا تذکرہ آتا ہے جن میں سے کسی ایک کی بھی شہرت آج کل کے مہذب زمانے میں بعض اوقات مضحکہ خیز معلوم ہو گی لیکن ہم ان کی قوتِ مشاہدہ اور صحیح قوتِ متخیلہ کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

ہم چاہتے ہیں کہ ان دعووں کی صداقت کے لئے قدیم شعرا کا نمونۂ کلام پیش کریں لیکن چونکہ اس سے ہم اپنے اصلی موضوع سے دور چلے جاتے ہیں اس لئے ہم مختصر اشارات کے ساتھ قدیم اور اسلامی دور کے عربی شعرا کے بہاریہ اشعار کا نمونہ پیش کریں گے جو ہمارے خیال میں اس موضوع پر پہلی کوشش ہے۔